Research Journal
Tahqeeqat
جلد:4، شمارہ:4، 2025ء
eISSN: 2791-0342
pISSN: 2791-0334
ریسرچ جرنل
تحقیقات

توصیف تبسّم کی غزل کی سائنسی جہات

The Scientific dimension of Tauseef Tabasum's Ghazal

Shoaib Ur Rahman
PhD Urdu Scholar, Riphah International University Faisalabad Campus
Dr Ghulam Shabir Asad
Associate Professor Urdu Government Graduate College, Jhang

شعیب الرحمٰن
پی۔ایچ ڈی اردو اسکالر رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی، فیصل آباد کیمپس
ڈاکٹر غلام شبیر اسدؔ
ایسوسی ایٹ پروفیسر اردو گورنمنٹ گریجویٹ کالج، جھنگ

Abstract

In this study, the ghazal of Tauseef Tabassum- an eminent poet associated with the postmodern era who emerged during the 1990s- has been examined in the context of scientific knowledge. His ghazal, through its symbolic and metaphorical semantic system, offers new dimensions to knowledge and art. Science is an empirical discipline that considers reality to be measurable, observable, and verificat ion. The Scientific trend of the nineteenth century influenced global intellectual attitudes and declared scientific authority as the sole path to truth. However, the atomic devastation brought about by science divided its worth into two domains: the epistemic and the experimental. From an intellectual and theoretical standpoint, Foucault's concept of discourse introduces new perspectives for understanding scientific knowledge. Drawing upon these scholarly debates, this study presents a semantic interpretation and explanation of scientific concepts through the ghazal "Asman The-e-Ab".

Keywords: *Tauseef Tabasum, Postmodern Ghazal, Scientific Epistemology, Symbolism and Metaphor, Discourse Theory, Semantic interpretation*

کلیدی الفاظ: توصیف تبسم، مابعد جدید غزل، سائنسی معرفت، علامتیت، ڈسکورس تھیوری، معنویت

سائنسی علم اُس منظم اور تجرباتی طرزِ علم کا نام ہے جو کائنات، فطرت اور مادّی مظاہر کو مشاہدے، تجربے، منطق اور علّت و معلول کے اُصول کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ سائنس کے نزدیک حقیقت کوئی جامد یا ماورائی چیز نہیں بلکہ قابلِ پیمائش، قابلِ مشاہدہ اور قابلِ آزمائش نظام ہے اِسی وجہ سے سائنسی علم انسانی فکر کی تشکیل میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور مسلسل ارتقائی عمل کے ذریعے انسانی شعور کے ابہام کا باعث بنتا ہے۔مابعد جدید عہد میں ادب کا دائرۂ کار احساس، تجربے اور جذبے میں علم، ساخت اور مشاہدے سے مربوط ہوتا ہے۔ ادب اور سائنس کا رشتا یونانی فلسفیوں کے دور ہی سے ہے۔ مسلمانوں کے سائنسی تجربات بھی انسانی شعور میں تخم اثر رکھتے ہیں اندلس صلیبی جنگوں کی نظر ہُوا تو پندرہویں صدی میں مسلم سائنس دانوں ابنِ سینا، رازی، البیرونی، ابن الہیثم ، نصیر الدین طوسی ایسوں کا سائنسی ورثہ یورپ منتقل کیا گیا اور مغرب میں کلیساؤں سے استقرائی و استخراجی طریقِ فکر اور عملی تجربوں کے ذریعے روایتی علم سے بغاوت سامنے آئی، پروفیسر ڈاکٹر محمد آصف اعوان لکھتے ہیں: "سولہویں صدی عقل و فکر کی برتری، فطرت کے مشاہدے اور تجربہ و تحقیق کا دور ہے۔ اس دور میں سائنس کے میدان میں

بعض ایسے افراد پیدا ہوئے جنھوں نے کلیسائے روم کے متکلمانہ افکار و نظریات کا طلسم توڑ ڈالا، اور انسان کو خرافات پر یقین کرنے کے بجائے تحقیق و تجربہ سے فطرت کے حقائق کی جستجو کرنے کی جانب متوجہ کیا۔"(1)

مسلمانوں کے ورثے سے سترہویں صدی تک یورپ میں سائنسی انقلاب سے ایک نئے ذہنی رویے کی تشکیل ہوئی جس میں انسانی مرکزیت، فطرت کی ریاضیاتی تعبیر، ٹیکنالوجی کا تاثر اور عقلیت اور تجربیت کی علمی جہات نے ایسے تصورات دیے جن کے اثرات کلیسا یا فلسفیوں اور سائنس دانوں کے گروہ تک محدود نہ تھے بلکہ سماجی حالات و واقعات کا سبب بن رہے تھے۔ تاہم سولہویں صدی عیسوی سے اٹھارہویں صدی عیسوی؛ مغرب کا کلیسائی الٰہیات اور فلسفے سے نکل کر تجربے، مشاہدے اور مسلمانوں کی ریاضیاتی پیمائشوں کی طرف متوجہ رہنا، سائنسی انقلاب کا دور کہلاتا ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں کائنات کی زمینی مرکزیت رَدّ کی گئی تو نیکولس کوپرنیکس (1473-1543؛ جرمنی) نے سورج کی مرکزیت کا نظریہ (Heliocentric) دیا، گلیلیو گلیلی (1564-1642؛اٹلی) نے مشاہداتی سائنسی طریق کے نئے ضابطے دیے، کیپلر (1571-1630؛جرمنی) نے سیّاروں کی حرکت کے قوانین اخذ کیے اور مشہور نیوٹن (1642-1727؛برطانیہ) کے حرکت کے تین قوانین نے کائنات کو ایک ریاضیاتی نظام سے متعارف کروایا۔ اِن میں فرانسس بیکن (1561-1626؛ انگلستان) کا تجربے، مشاہدے اور قابلِ تکرار نتائج کا استقرائی طریقِ علم اور نیوٹن کا میکانکی تصور اہم ہے۔ نیوٹن کی میکانکی کائنات میں حقیقت تکرارِ نتائج پر مبنی ایک انتظام کو کہا جانے لگا اور خدا کی ذات کو اضافی تصور کیا جانے لگا۔ کلیسا اور سائنس دانوں میں شدت نے زور پکڑا، ان میں گیروڈآنو برونو کو 1600ء میں جلایا گیا جو اٹھارہویں صدی میں سائنسی آزادی کے لیے ایک سماجی رویے کی صورت اختیار کر گیا، اس کے علاوہ ولٹیر کا فرانس سے نکل کر انگلستان میں پناہ لینا، ڈینس ڈیڈرو اور روسو پر کلیسائی فتووں نے اس تصادم کو مزید شدت دی مگر سائنسی علوم کی حیرتوں نے جلد کلیسائی فتوؤں کی اہمیت اور وقعت کو رد کر دیا اور ایسے ذہنی رویے کی تشکیل ہوئی جس نے تجربے اور عقلی استعدادوں سے روشن خیالی کے ذریعے نئے تحلیلی طریقِ تحقیق کو رواج دیا۔ جس سے علم کی پیش رفت صنعتی استحصال کے عالمی نمونوں سے ہوتی ہوئی، ٹیکنالوجی میں توانائی کے بل بوتے پر علم کی برقی صورت متعارف کرواتی ہے۔ انیسویں صدی میں بجلی، ٹیلیفون، ریڈیو، لائٹ بلب وغیرہ نے قانونِ فطرت کی میکانکی اور ریاضیاتی سچائیوں سے، تسخیر نے سائنس کو ایسی فتح دی کہ سماج، انسان اور ان سے منسلک دوسرے اداروں کو سائنسی اصول و طریقِ تحقیق پر استوار کرنے کی کوششیں سامنے آنے لگیں۔ جس نے علم کو مشاہدے، تجربے اور قانونِ فطرت تک محدود کر دیا۔ یہ وہ نقطۂ آغاز تھا جب علم کو اخلاقی یا روحانی قوت سے جدا کر کے تجرباتی قوت کے طور پر دیکھا گیا۔ اگست کومٹے (پ:1798، فرانس) نے اسے یوں تحریر کیا:

(2)"there can be no real knowledge but that which is based on observed facts."

ترجمہ: ایسا کوئی حقیقی علم موجود نہیں ہو سکتا جو مشاہدہ شدہ حقائق پر مبنی نہ ہو۔

اس کی اثباتیت (Positivism) نے سماج کو بھی ایک میکانکی تصور دینے کی کوشش کی، جس سے سماجی رویوں کا تصادم سائنسی ایجادات اور اختراعات سے ہونے لگا۔ انسانی علوم کا تجربہ قدرتی علوم کے تجربے سے مختلف ہونے کی وجہ سے نئے سوال اٹھاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں اعداد و شمار کی پیمائش کو کافی نہ سمجھا گیا اور معنویت کو سمجھنا اہم سمجھا جانے لگا۔ ماکسی ملین ویبر (1864ء-1920ء) نے انسانی تجربے میں عمل کے ردِ عمل کے بجائے ارادے اور مقصد کو اہمیت دی۔ جدیدیت میں وجودی بے معنویت، گمان اور داخلی تجربے نے انسان، کائنات اور نظامِ حرکت اور

قوت کی یکسانیت پر سوال اٹھائے۔ وقت و مکان کی سالمیت میں روشنی کے نیوٹنی مادّے کے تصور کو امریکی مائیکل سن-مورلی تجربہ (1887)-[3] نے ایتھر (Aether) کے عدم موجودگی کا تجربہ پیش کیا، 1873ء میں میکسویل نے A Treatise on Electricity and Magnetism میں 20 ایسی مساواتیں ((Equations) (جواب صرف چار مساواتوں کے طور پر مشہور ہیں، جنھیں اب Heaviside Maxwell Equations بھی کہا جاتا ہے) دیں اِس نے بجلی اور مقناطیس کے ارتعاش سے روشنی کو ایک برقی لہر (Electromagnetic) کہا، نیوٹن تک کے مادّے کے تصور پر روشنی کا غیر مجسم اور غیر مادّی موجودگی کا ثابت ہونا، مادّے کے تصور کو نئی جہتیں دیتا ہے۔ اس نے کہا روشنی نہ مادّہ ہے اور نہ مادّی اشیا کے قانونِ حرکت پر حرکت کرتی ہے بلکہ ایک سمت (Field) میں سفر کرتی ہے اور مادے پر اثر انداز ہوتی ہے۔ جس سے بیسویں صدی کے آغاز ہی میں مادّی سماجی سائنس کو بھی بحران کا سامنا ہوا (ہر چند اس کے پسِ پردہ کئی قدرتی و فطرتی تبدیلیاں ہی تھیں، جو سائنس کا بنیادی سوال ہے) اِنھیں بنا پر آئن سٹائن (1879-1955) نے نظریۂ اضافیت سے مادّے اور توانائی کے تعلق کو واضح کیا۔ اس نے روشنی میں فوٹون (Photon) کی مادّی حالت کو دریافت کیا اور مادّے کی اِس صورت اور توانائی کو ایک ہی شے کی دو صورتیں کہا بلکہ مادّہ توانائی ہی کا جامد روپ ہے یعنی مادّہ توانائی میں بدل سکتا ہے اور توانائی مادّہ بن سکتی ہے۔ مادّے کی یہ غیر مستقل صورت مادّے کی بنیادی وجودی حیثیت کو رد کرتی ہے۔ یعنی تھوڑا سا مادہ بے انتہا توانائی بن سکتا ہے اِس تصور کی تجرباتی کئی صورتیں منظر عام پر آئیں۔ دُور بین کے لائٹ میٹر، الارم سسٹم اور کیمرا لائٹ میٹر؛ اِن آلات کی ایجاد میں کارفرما ایسے فوٹو سیل؛ جو روشنی کے ذرّے کی تلاش کرتے؛ یہ آلات اُن روشنی کے ذرّات کو برقی رَو میں بدلتے تھے۔ اِسی طرح ٹیلی ویژن کے تجربے کی کامیابی 1925ء میں لندن میں جان لوگی بارئرڈ نے متحرک تصویر دکھا کر کی، 1929ء تک بی بی سی کے اشتراک سے رنگین براہِ راست متحرک تصویر کا مشاہدہ ممکن ہوا۔ علاوہ ایسی حیرتوں کے آئن سٹائن کے اضافیت کے تصور نے ایٹمی توانائی پر ٹیکنالوجی کا راستا بھی ہموار کیا۔ خود موصوف امریکا کو "ای۔ فرمی اور ایل۔ زیلر کے وہ تحقیقی کام جو میرے حوالے کیے گئے ہیں، مجھے یہ توقع دلاتے ہیں کہ عنصر یورینیم قریب مستقبل میں توانائی کا ایک نیا اور نہایت اہم ذریعہ بن سکتا ہے۔"[4] کی خبر پہنچاتا ہے۔ بیسویں صدی میں طاقت کے حصول کا یہ تجربہ؛ دوسری جنگ میں 6 اگست 1945 کو امریکا کا جاپان کے شہر ہیروشیما اور 9 اگست کو ناگاساکی کے مقام پر قیامت خیز ثابت ہوا۔ جنگ کے بعد انسانی مرکزیت، ترقی، علم کی مطلقیت اور سچائی کے دعوے خارجی اور داخلی اعتبار سے مکمل طور پر منتشر ہوگئے تھے۔ اس سے مادّے کی وہ سماجی حیثیت جو جدیدیت نے مادّیت کی صورت میں دی تھی، رَدّ کر دی گئی۔ عالمی منظر نامہ نظری اور تجرباتی دونوں صورتوں میں بدلنے لگا۔ یورپیوں کی نو آبادکاری طاقت کے جس سرمایہ کارانہ سماج کو ترتیب دینا چاہتی تھی، امریکا نے ایٹمی دھاکوں سے اُس کے پرخچے اُڑا دیے تاہم سائنسی علم کے طاقت کے اِس تجربے نے عالمی سطح پر یہ رویہ تشکیل دیا کہ جو انسانی بقا، حقوق اور آزادی سے مربوط تھا۔ سائنس کی اخلاقی ذمہ داریوں پر سوال اٹھائے گئے۔ اِس دہائی میں تھوماس کوہن (1922-1996) نے سائنسی اقتدار پر سوال اٹھایا اور سائنسی انقلابات کو غیر مستقل قرار دیا، لکھتا ہے:

> "That is the structure of scientific revolutions: normal science with a paradigm and a dedication to solving puzzles; followed by serious anomalies, which lead to a crisis; and finally resolution of the crisis by a new paradigm.'[5]

ترجمہ: سائنسی انقلابوں کی ساخت کچھ یوں ہے: ایک پیراڈائم کے تحت 'نارمل سائنس' ہوتی ہے، جس کا مقصد معمے (puzzles) حل کرنا ہوتا ہے؛ پھر ایسے سنجیدہ مظاہرات (anomalies) آتے ہیں جو ایک بحران (crisis) پیدا کرتے ہیں؛ اور آخر میں اسی بحران کا حل ایک نئے پیراڈائم کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

تاہم تھامس کوہن یہ اخذ کرتا ہے کہ سائنس "اتھارٹی" نہیں بلکہ انسانی تاریخ کی طرح بدلتی ہے۔ فے رابینڈ کو سائنس مخالف کہا جانے لگا جب کہ وہ لکھتا ہے:

"What are thought to be the laws of scientific method by a particular writer, are even integrated into anarchism itself."(6)

ترجمہ: ایک خاص مصنف کے خیال میں جن اصولوں کو سائنسی منہج کے قوانین سمجھا جاتا ہے، وہ انارکسزم کے نظریے میں بھی شامل کر لیے گئے ہیں۔

فے رابینڈ نے سائنس کے اخلاقی حیثیت پر تنقید کی تاہم عالمی منظر نامے کے پس نظر میں سائنس مکمل طور پر غیر اخلاقی بیانیہ رکھتی ہے، تسلیم کیا جانے لگا۔ سائنس پر تنقید کرنے والوں میں کارل پوپر (1902-1994) کی تنقیدی تھیوری سائنس کا بنیادی اصول ابطال پذیری (Falsification) واضح کیا کہ اِس علم سے کوئی نظریہ ثابت نہیں ہو سکتا، صرف رَدّ کیا جا سکتا ہے۔ یعنی سائنس ہمیشہ غلط ثابت ہونے کے امکان پر اپنے تصور کی بنیاد رکھتی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"Objections are bound to be raised against my proposal to adopt falsifiability as our criterion for deciding whether or not a theoretical system belongs to empirical science. They will be raised, for example, by those who are influenced by the school of thought known as 'conventionalism'(7)

ترجمہ: "میری اس تجویز کے خلاف کہ ہم ابطال پذیری (falsifiability) کو یہ طے کرنے کا معیار بنائیں کہ کوئی نظری نظام تجربی سائنس سے تعلق رکھتا ہے یا نہیں، لازماً اعتراضات اٹھائے جائیں گے۔ یہ اعتراضات، مثال کے طور پر، اُن لوگوں کی طرف سے سامنے آئیں گے جو فکر کے اُس مکتب سے متاثر ہیں جسے 'روایتیّت' (conventionalism) کہا جاتا ہے۔

تاہم اِس نے سائنس کی اتھارٹی کو یکسر رد نہیں کیا بلکہ محدود کر دیا اور سائنس کو ایک مسلسل تنقیدی عمل قرار دیا۔ پوپر کے تنقیدی تسلسل کے اِس علم کا تجرباتی اور نظریاتی پہلو جدا ہوا۔ علمی اعتبار اِسی پہلوؤں سے جدیدیت کے طے کردہ بیانیوں (Meta Narrative) کو رد کرتا ہے۔ جاپانی مابعد جدیدیت کے مفکر لیوٹارڈ (1924ء-1998ء) نے یہ نقطۂ نظر اپنایا:

"Simplifying to the extreme, I define postmodern as incredulity toward metanarratives."(8)

ترجمہ: انتہائی سادہ الفاظ میں، میں مابعد جدیدیت کو بڑے بیانیوں پر عدمِ اعتماد کا نام دیتا ہوں۔

تاہم مابعد جدیدیت حقیقت کے اثبات اور غیر جانب داری پر سوال اٹھاتی ہے۔ جدیدیت جو حقیقت کا کُلی روپ پیش کرتی ہے دراصل وہ یک طرفہ ہے۔ تاہم مابعد جدیدیت نے آئین سٹائنی مساوات کے بعد حقیقت تک رسائی کے علوم کو فلسفیانہ اور علمی بحث کا رُخ موڑنے میں میشل فوکو(1926-1984؛ فرانس) کا ڈسکورس تصور اہم ہے۔ جس نے علم، طاقت اور حقیقت کے تعلق کو نئے نظام میں مرتب کیا۔ فوکو علم پیدا کرنے کے طریقوں کو زبان، طاقت، اداروں اور معاشرت کا مجموعی نظام سے سمجھاتا ہے جو حقیقت کو تشکیل دینے کا میکانزم رکھتے ہیں۔ وہ اِس ضمن میں زبان، طاقت اور علم کو بنیادی حیثیت دیتا ہے جو ایک ایسے نظام کو متعارف کراتے ہیں جو یہ طے کرتا ہے کہ کون سی بات سچائی کے معیار پر ہے، کس طرح علم پیدا ہوتا ہے اور پھیلتا ہے، اور سماجی ادارے، رویے اور شناختیں کس طرح تشکیل پاتی ہیں؟ فوکو کے مطابق زبان صرف اظہار کا ذریعہ نہیں بلکہ معانی پیدا کرنے کا مکمل نظام ہے۔ زبان ڈسکورس میں رکاوٹ اور اجازت دونوں کا کام کرتی ہے۔ اہم زبان ایک تاریخی شے ہے اور یہ زمانے کے ساتھ وجود رکھتی ہے۔ یہ طے کرتی ہے کہ کس طرح حقیقت کو جانا جائے۔ فوکو لکھتا ہے:

> "language (langue) perhaps, is essentially historical, that it was made up not of available elements, but of real, successive events, that it cannot be analysed outside the time in which it occurred." (9)

ترجمہ: زبان (لانگ)، شاید اپنی اصل میں ایک تاریخی حقیقت ہے؛ یہ محض پہلے سے موجود عناصر پر مشتمل نہیں بلکہ حقیقی اور پے در پے وقوع پذیر ہونے والے واقعات سے تشکیل پاتی ہے، اور اسے اس زمانے سے الگ کر کے تجزیہ نہیں کیا جا سکتا جس میں یہ وجود میں آئی۔

علم اور طاقت کے تعلق کو واضح کرتے ہوئے وہ تحریر کرتا ہے:

> power is strong this is because, as we are beginning to realise, it produces effects at the level of desire–and also at the level of knowledge." (10)

ترجمہ: طاقت اس لیے مضبوط ہے کہ، جیسا کہ ہم اب سمجھنے لگے ہیں، وہ خواہش کی سطح پر بھی اثرات پیدا کرتی ہے—اور علم کی سطح پر بھی۔

یہاں فوکو طاقت کو جبری یا حکومتی اختیار کے لیے استعمال نہیں کرتا بلکہ علم پیدا کرنے اور حقیقت کے معیارات متعین کرنے کی طاقت مراد لیتا ہے گویا ڈسکورس میں طاقت یہ طے کرتی ہے کہ کون سا علم معتبر اور کون سا غیر معتبر ہے۔ ڈسکورس کا مرکزی عنصر "علم" زبان اور طاقت کے اصولوں پر حقیقت کی تشکیل کرتا ہے۔ علم ایک تاریخی اور سماجی تناظر رکھتا ہے جس پر وہ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ کون سی حقیقت "سچ" ہے اور کون سی "جھوٹ" ہے۔ فوکو سائنسی علم کو بھی ڈسکورس کے ضمن میں موضوع بناتا ہے۔ جدیدیت کا ستون یہ علم جس بیانیے، طاقت اور سماجی حقیقت کے نئے تناظر میں موضوع بنا۔ اُس نے کہا کہ سائنس بذاتِ خود حقیقت نہیں ہے بلکہ حقیقت ڈسکورس کے تحت بنتی ہے۔ سائنسی علم بذاتِ خود طاقت کے نظام سے پیدا ہوے اہے اور اسے مضبوط کرتا ہے تاہم حقیقت کو جانچنے کے لیے سائنسی علم غیر جانب دار نہیں ہے۔ اسی وجہ سے اِس علم میں عالم گیریت اور آفاقیت کے بجائے معاشرتی سچائی پر ہی انحصار ہوتا ہے۔ فوکو لکھتا ہے:

"Each society has its regime of truth, its general politics' of truth: that is, the type of discourse it accepts and makes function as true."(11)

ترجمہ: ہر معاشرے کا اپنا نظامِ سچائی ہوتا ہے، اپنی سچائی کی رجیم؛ یعنی وہ ڈسکورس جنھیں معاشرہ قبول کرتا ہے اور بطور سچ کارفرما کرتا ہے۔

تاہم یہ معاشرہ ہی طے کرے گا کہ کون سی سائنسی بات قابلِ قبول ہے مگر سائنسی علم اپنی ذات میں سچائی کی رجیم کے کنٹرول کی طاقت رکھتا ہے۔ فوکو رقم طراز ہے:

"Science has become the major from of knowledge that defines what is accepted as true in modern societies." (12)

ترجمہ: سائنس جدید معاشروں میں وہ بنیادی علم بن گئی ہے جو طے کرتا ہے کہ حقیقت کیا ہے اور سچ کیا قبول کیا جائے گا۔

فوکو کے ڈسکورس نے سائنسی علم کا نظریاتی ساخت واضح کی۔ سائنس میں مادّے کی کوانٹم حالت نے غیر یقینیت کے رویوں کو جنم دینا شروع کیا اور اکیسویں صدی میں ڈیٹا کی پیش رفت اہم ہے جو انٹرنیٹ، موبائل فون، سمارٹ ٹیکنالوجی اور کوانٹم تصورات کئی نئے رویے متعارف کروا رہے ہیں۔

سائنس کے اس رویے نے مشاہداتی انحصار (Observer dependent) کو فوقیت دی۔ یہ تصورات یقینیت سے غیر یقینیت، مطلقیت سے غیر مطلقیت اور سچائی کی ذاتی حقیقت کو شاہد پر منحصر ہونے کی وضاحت پر مبنی ہیں۔ تاہم بالا تمام بحث سائنسی تصور، سائنسی زبان، سائنس بہ طور سچائی، بہ طور اتھارٹی یا بہ طور مسئلہ، سائنس کو مثبت، منفی یا غیر جانب دار دکھانا یہ بنیادی موضوع ہیں جو سائنسی جہت کو کسی بھی ادب پارے میں تلاشنے میں فوٹون کا کردار رکھتے ہیں۔ فوکو کے نظریے کے پیشِ نظر ادبی زبان کئی آلات کی معنیاتی تہیں کھولتی ہے۔ اگر ہم فوکو کی اِس تھیوری کا مطالعہ اردو ادب کے ضمن میں کریں تو نتیجہ یہ اخذ ہونا چاہیے کہ متن مابعد جدیدیت کے فکری مباحث سے ہم آہنگ ہو مگر اُردو ادب میں جدیدیت کے مباحث بیسویں صدی نصف بعد داخل در علوم ہوئے ہیں۔ ادب میں میراجی (1912-1949) کی سارتر (1905-1980) کے نفسیاتی مباحث کی نظمیں اہم ہیں۔ اس دور میں اُردو ادب، نثری اصناف میں جدیدیت کے مباحث میں مغربی فکر سے ہم آہنگ ملتا ہے، اس کی بنیادی وجہ سر سید اور اُن کے دوستوں اور دشمنوں کی مشترکا کاوش تھی۔ بہر کیف نثر یورپی نو آبادکاری سے پہلے اور نظم بعد میں جدیدیت کے مباحث میں داخل در موضوع و معروض ہوتی ہے۔ غزل کی صنف جو کبھی نثر کے مقابل صدیاں گزار چکی تھی، نظم کے منظر نامے میں پوشیدہ ہوتی گئی۔ بشیر بدر "آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ"(13) میں اُس وقت کے رسائل میں غزل و نظم کے تناسب کرتے ہوئے نظم کا پلڑا بھاری ثابت کرتے ہیں پھر بھی غزل کے جدید شعرا میں علی سردار جعفری، یوسف ظفر، منیر نیازی، احمد فراز، اختر ہوشیار پوری، ناصر کاظمی، فراق گورکھپوری اور جون ایلیا نمایاں ہیں۔ اِن سب کے ہاں جدیدیت کا وہ رنگ غالب ہے جو کسی نہ کسی بیانیے (Grand narrative) کے فکری رو سے منسلک ہے۔ تاریخی اعتبار سے یہ وہ لوگ ہیں جو پختہ عمر میں نو آبادکاری کے بیانیے کو رد کرنے کا مشاہدہ اور تجربہ رکھتے تھے، مگر نو آبادکاری کا نوجوانی میں تجربہ اور مشاہدہ رکھنے والوں (آفتاب اقبال شمیم، احمد ندیم قاسمی، خورشید رضوی اور افتخار عارف وغیرہ) میں بہ طور شخص و شاعر محمد احمد توصیف تبسّم مرحوم اُردو کے تہذیبی و ثقافتی اور اخلاقی و لسانی اعتبار میں غزل کے مقام کو قائم رکھتے ہیں۔(14) انھوں نے

آخری عمر تک غزل کہی، جو سہ ماہی اکادمی ادبیات میں چھپتی رہیں، ہم اس مطالعہ میں بالا بحث کے ضمن میں "آسمان تہِ آب" کی غزلوں کی سائنسی جہت کے ڈسکورس سے معنیاتی رسائی حاصل کریں گے۔

زبان کی ابتدائی جغرافیائی حدود صرف ہندوستان سے ملتی ہیں۔ ہندوستانی معاشرہ جو علم کی توضیح و تفہیم کا اہل صرف برہمنوں کو دیتا تھا؛ تو علمی آزادی مسلمانوں کے حملوں سے ممکن ہوئی لیکن ہندو اقتدار میں بھی علمی آزادی کی کئی تحریکیں متحرک رہی ہیں۔ بہر کیف مسلمانوں کے گیارہ سو پینتالیس سالہ اقتدار کے بعد جب ہندوستان برطانوی سائنسی معاشرے پر تشکیل پانے لگتا ہے تو فرد کے انفرادی اور اجتماعی شعوری ترقی کا باعث بنتا ہے، اگست 1947ء تک برطانوی مشینری یہاں کام کرتی رہی، ہندوستان کی برطانوی نَو آبادکاری، سرد جنگ (1947–1991) کے دور میں امریکہ اور سوویت یونین دونوں نے تیسری دنیا کو اپنے نظریاتی دائرے میں لانے کے لیے ثقافتی بیانیوں کا استعمال کیا۔ مابعد نو آبادیاتی ادب نے اس صورتِ حال میں استعماری اور نیم استعماری بیانیوں کو بے نقاب کیا اور یہ دکھایا کہ کس طرح سرمایہ دارانہ جمہوریت اور اشتراکی مساوات— دونوں—اکثر نو آبادیاتی تسلسل کا ذریعہ بنیں۔ پاکستان کا قیام (1947) محض ایک نئی ریاست کی تشکیل نہیں بلکہ ایک مابعد نو آبادیاتی تجربہ تھا جو ابتدا ہی سے سرد جنگ کی نظریاتی کشمکش اور سرمایہ دارانہ و اشتراکی نظاموں کے دباؤ میں آ گیا۔ یہی تاریخی صورتِ حال پاکستانی اردو ادب کے فکری، موضوعاتی اور اسلوبی رویّوں کی تشکیل میں بنیادی عامل بنی۔ پاکستان کو آزادی تو ملی مگر نو آبادیاتی انتظامی ڈھانچا برقرار رہا، معاشی انحصار مغرب پر قائم رہا اور فوجی و بیوروکریٹک ریاست وجود میں آئی۔ یہ تمام عناصر مابعد نو آبادیاتی ریاست کی کلاسیکی علامات ہیں، جن کی بازگشت اردو ادب میں نمایاں طور پر سنائی دیتی ہے۔ سرد جنگ میں پاکستان امریکی سرمایہ دارانہ بلاک کا اتحادی بنا، اشتراکیت کو ریاستی سطح پر خطرہ قرار دیا گیا۔ نتیجتاً اردو ادب میں ترقی پسند ادیب ریاستی دباؤ کا شکار ہوئے۔ اشتراکی فکر کو شک، غداری اور بغاوت سے جوڑا گیا اور ادیب و شاعر یا تو خاموش ہوئے یا علامتی اظہار پر مجبور ہوئے۔

توصیف تبسم مرحوم نے اسی نظریے، مشاہدے اور تجربے کو اپنے کلام کا موضوع بنایا ہے۔ آپ ایک صاحبِ علم اور کتاب دوست انسان تھے، آپ نے 1988ء[15] میں ڈاکٹریٹ کی۔ راقم ایم۔اے اور ایم فل کی سندی تحقیق کے لیے رابطے میں رہا۔ اپنی گفتگو اکثر فلسفیانہ، اسلامی اور سائنسی موضوعات پر رکھتے تھے۔ وہ علم کی داخلی و خارجی اور روحانی و جسمانی صورتوں پر استادانہ آرا رکھتے تھے مگر تمام زندگی اُردو زبان و ادب کے خادم کے طور پر گزاری، اُن کی غزل استعاراتی اور علامتی نظام میں کثیر العلومیاتی معنیاتی جہتیں رکھتی ہے۔ ہر شعر معنی کا ایک الگ ستارا ہے، آفتاب اقبال شمیم لکھتے ہیں:

> "معنیٰ سے ورائے معنیٰ کی طرف خفیف سا گریز توصیف تبسم کی غزل کی نہایت منفرد خاصیت ہے جس نے نئی غزل کو بالواسطہ متاثر بھی کیا ہے۔ شعر کو ذرا سا آؤٹ آف فوکس کرنے سے ایک تو مفہوم کی تہ داری بڑھ گئی ہے اور دوسرے ایک ایسا اسلوب پیدا ہوا ہوا جو توصیف تبسم کی جداگانہ پہچان متعین کرتا ہے۔"[16]

تاہم ہم عصر تخلیق کار اور نقاد دوست کی یہ رائے توصیف تبسم کی غزل میں روایتی موضوعات کو (آؤٹ آف فوکس) جامد معنوں کے بجائے متحرک معنوی جہت تلاشنے کی وسعت ہے۔

شعر دیکھیے، جذبات کو توانائی (Energy Transformation) کے سائنسی تصور سے جوڑتا ہے۔ رونا محض جذباتی عمل نہیں بلکہ اعصابی اور ہارمونل سطح پر ایک مسلسل نظامِ عمل ہے۔ نیروسائنس کے مطابق رونے سے cortisol ایسے اعصابی تناؤ خارج ہوتے ہیں، جس سے وقتی سکون پیدا ہوتا ہے۔ "موجِ تنک آب" سے ظاہر کیا گیا ہے کہ معمولی داخلی محرک کس طرح بڑے جذباتی اخراج میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہاں رونا ایک ذاتی فعل نہیں بلکہ طاقت کے دباؤ کے خلاف مائیکرو ریزسٹر ہے۔ فوکو کے نزدیک جسم محض حیاتیاتی وجود نہیں بلکہ بیانیاتی جسم ہے، جہاں جذبات، طاقت اور علم باہم تعامل کرتے ہیں۔ طبیعیات میں یہ کیفیت غیر خطی نظام سے مشابہ ہے، جہاں ایک معمولی توانائی بڑے بہاؤ میں بدل جاتی ہے:

واقعہ یہ ہے کہ رونے میں عجب لذت ہے
رونا اور موجِ تنک آپ کو دریا کرنا(17)

مادّی مزاحمت اور تخلیقی توانائی کے سائنسی تصور سے مربوط مضمون دیکھیے۔ موسیقی کی پیداوار فریکوئنسی، ارتعاش اور دباؤ کا نتیجہ ہوتی ہے، مگر جسمانی زخم کو اس کا لازمی جزو کہا گیا ہے تاہم یہاں علمِ صوتیات کے ساتھ جسم بہ طور آلہ سامنے آتا ہے۔ آواز کو نغمہ بنانا آسان نہیں کیوں کہ اس کے لیے جسم، اعصاب اور مادّے کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ طبیعیات کے مطابق آواز ارتعاش اور دباؤ کا نتیجہ ہے مگر انسانی سطح پر یہ جسمانی مشقت اور درد کے بغیر ممکن نہیں۔ تاہم نغمہ محض آواز نہیں بلکہ ثقافتی تناظر میں طاقت اور معانی پاتا ہے، یہی وجہ ہر آواز نغمہ نہیں بن سکتی:

زخمِ مضراب سے رِستا ہے لہو پوروں کا
کتنا دشوار ہے آواز کو نغمہ کرنا(18)

زمان اور وقت کی شعوری تشکیل اور مشاہداتی تھیوری کی علامتی تشکیل بھی سامنے آتی ہے۔ جدید سائنس بتاتی ہے کہ وقت ایک مطلق حقیقت نہیں بلکہ مشاہدہ کرنے والے پر منحصر ہے۔ شعر کہتا ہے کہ ہم وہی دیکھتے ہیں جو وقت دیکھاتا ہے، یعنی شعور ایک مثبت شاہد بن چکا ہے۔ "نظر بستہ" ہونا فوکو کے تصور ڈسکورس سے جڑتا ہے جہاں طاقت اور علم طے کرتے ہیں کہ کیا دکھائی دے گا اور کیا نہیں:

جو وقت دکھاتا ہے سو دیکھتے ہیں
اس بزمِ تماشا میں بیٹھے ہیں نظر بستہ (19)

صوت اور خون کو ایک دوسرے میں مدغم ہونے سے صوتی نظام کا تفہیمی پہلو یہ سامنے آتا ہے کہ سائنسی سطح پر آواز محض ہوا کہ لہر ہے، مگر انسانی جسم میں یہ نیوروکیمیکل ری ایکشن پیدا کرتی ہے۔ شعر لہر کو "لہو میں" قرار دے کر یہ واضح کیا گیا ہے کہ اصل اثر قابلِ پیمائش نہیں۔ سائنسی ڈسکورس میں یہ اس نکتے کی طرف اشارہ ہے کہ تمام علم قابلِ پیمائش نہیں ہوتا:

صدا کے ساتھ لہو میں جو لہر اٹھتی ہے
تمام دسترسِ نمناخواں سے باہر ہے(20)

واپسی ایک معنیاتی تشکیل جہاں "دریا" محض پانی نہیں بلکہ وقت-یاد-تجربہ کے نظام ہے جو بہاؤ میں رہ کر معنی محفوظ رکھتا ہے۔ یہاں زبان یہ بتاتی ہے کہ حرکت خود مقصد نہیں؛ گردشِ موصد ہے، یعنی معنی ایک مقام سے دوسرے مقام تک جا کر پھر لوٹتے ہیں۔ یہ شعر ہائیڈروجیکل سائیکل

(Water Cycle) کو استعارہ بناتا ہے۔ دریا کے بخارات سے بادل بننا اور بارش کے پانی کا دریا میں لوٹ جانا، سائنسی حقیقت یہاں علمی اتھارٹی بھی اور شعری علامت بھی ہے۔ یہاں علّت و معلول واضح ہے کہ بہاؤ، واپسی کے لیے شرط ہے:

پلٹ کر آئے گا بادل کی صورت
اِسی خاطر تو دریا بہ رہا ہے[21]

علم ادراک (Epistemology of Science) کا بنیادی مسئلہ نہیں شائستگی سے بیان کیا گیا ہے۔ انسانی حواس کے محدودیت کے سبب علم نامکمل ہے۔ جدید سائنس (کوانٹم فزکس اور کاسمولوجی) میں یہ تسلیم شدہ اُصول ہے کہ مشاہدہ مکمل حقیقت تک رسائی نہیں دیتا۔ یہاں انسان کو ناکامل سائنسی مشاہد کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ جدید سائنس یہ تسلیم کرتی ہے کہ انسانی علم حتمی نہیں بلکہ مشروط ہے۔ حواس، آلات اور نظری مباحث حقیقت کو مکمل طور پر نہیں سمیٹ سکتے۔ کارل پوپر کے نزدیک سائنسی نظریہ کبھی ثابت نہیں ہوتا، صرف رد ہو سکتا ہے جب کہ ہائزن برگ کے مطابق مشاہدہ خود حقیقت کو بدل دیتا ہے:

محدود حواس اپنے، مفقود خبر اپنی
کھلتی ہی نہیں پم پر یہ راہِ سفر بستہ[22]

نسبتیت (Relativity) اور مشاہداتی اثر (Observer Effect) کا شعری اظہار دیکھیے۔ جسم ساکن ہے مگر عکس متحرک ہوتا ہے، یعنی حقیقت مشاہد کے زاویے سے بدلتی ہے۔ جدید سائنس میں مشاہد غیر جانب دار نہیں۔ آئن سٹائن کے مطابق حرکت مطلق نہیں، نسبتاً ہے اور نیلز بوہر مشاہدے اور مظہر کو الگ نہیں سمجھتا:

کھڑا ہوں ساکت و ششدر کنارِ دریا پر
مگر میں عکسِ سرِ آب بن کے بہتا ہوں[23]

مادّی حقیقت کے انہدام اور توانائی کی بالادستی کا بیان جہاں سورج کو ایک شے نہیں بلکہ حرارت / توانائی کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ جدید طبیعیات کی زبان میں ماہیّت مادّی نہیں بلکہ حرکی اور توانائی ہے، یعنی مادہ اور توانائی الگ نہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کی دو صورتیں ہیں:

رات کا پتھر جو آنکھوں پر دھرا رہ جائے گا
اک حرارت کے سوا خورشید کیا رہ جائے گا[24]

ایک شعر اور دیکھیے جو اس سچائی کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ہو دور میں غالب نظریہ (چاہے سائنس ہو) اختلاف کو برداشت نہیں کرتا۔ جو فرد مروجہ پیمانوں سے ہٹ کر تشریح کرتا ہے، اسے ردیا سزا دی جاتی ہے۔ یہ وہی صورت ہے جسے جدید فلسفۂ سائنس میں نارمل سائنس کا جبر کہا جاتا ہے۔ یہ کوہن کے پیراڈائم شفٹ کی شعری صورت ہے:

مجھے بھی آج کے نقّاد دار پر کھینچیں
کہ میں بھی اُس قدِ زیبا کو سرو کہتا ہوں[25]

سائنسی تصور Entropy کو علامتی تصور کہ جب نظام ٹوٹتا ہے تو بامعنی آواز (Signal) ختم ہو جاتی ہے اور صرف شور باقی رہتا ہے۔ سائنسی دنیا میں یہ معانی کے زوال کی علامت ہے:

کشتیوں کے ساتھ ڈوبے گی صدا سیلاب کی
اور ساحل پر فقط شورِ پوا رہ جائے گا(26)

کوانٹم فزکس کے اس تصور سے ہم آہنگ ہے کہ ہر ذرہ اہم اور باہم مربوط ہے۔ جدید سائنس میں کوئی شے حقیر نہیں، خرد ترین اکائی بھی نظام کا حصہ ہے۔ یہ سائنسی ڈسکورس انسان کو انکسار اور احتیاط کی دعوت دیتا ہے:

ہو سکے تو چوم لے پاؤں تلے کی خاک کو
ذرہ ذرہ ہے جہانِ معتبر، آہستہ چل(27)

یہ شعر انعکاسی علم کی نمایندگی کرتا ہے۔ جدید سائنسی فکر میں محقق خود بھی مطالعے کا حصہ ہوتا ہے۔ آئینہ ذاتی مشاہدے کی علامت ہے جہاں زبان ناکافی ہو جاتی ہے یعنی علم محض الفاظ نہیں بلکہ تجربے اور درد سے جنم لیتا ہے:

سر میں نے آئینے سے گفتگو کی
سخن ہوتے نہ تھے خواب میرے(28)

یہ شعر Complexity اور Chaos Theory کے اُصول کو ظاہر کرتا ہے۔ سائنسی ڈسکورس میں نظام جامد راستوں پر نہیں چلتے بلکہ خود راستے تشکیل دیتے ہیں۔ قوانین بھی حالات کے ساتھ بدلتے ہیں۔ یہ خود تنظیمی کی شعری تعبیر ہے:

کیا کریں گردشِ جہاں کا گلہ
راستے خود یہاں سفر میں ہیں(29)

یہ شعر وقت کے بہاؤ اور انسانی شناخت کے سائنسی تصور کی تعبیر لیے ہوئے ہے۔ زکس میں وقت کو ایک ناقابلِ واپسی بہاؤ مانا جاتا ہے، جو ہر شے کو اپنے ساتھ بہا لیے جاتا ہے۔ انسان اس بہاؤ میں خس و خاک کی مانند ہے۔ "دریا سے الگ دریا" انسانی وقت اور کائناتی وقت کے فرق کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی انسان تاریخ اور کائنات کے بڑے بہاؤ میں شامل تو ہے مگر اس پر دسترس نہیں رکھتا۔ یہ شعر وجودی سائنس کی شاعرانہ صورت ہے:

وقت کی لہر بہائے لیے جاتی ہے ہمیں
ایک دریائے خس و خاک ہے دریا سے الگ(30)

تاہم اس تفہیم و تعبیر سے ہم یہ بات وثوق سے کہ سکتے ہیں کہ توصیف تبسم علامتی و استعاراتی اور معنیاتی نظام میں علم کی مشاہداتی اور تجرباتی صورت کے معتبر و مستند غزل میں "مجید امجد کی نظم" کے بعد کی علمی تصورات کو موضوع بناتے ہیں۔ اِس کی وجہ اِس کا ابتدائی نمونے کا عالمی مابعد جدیدیت سے پیوستہ سنین ("کوئی اور ستارہ"۔1996ء) میں منظرِ عام پر آیا۔ غزل اور نظم کا یہ مجموعہ میزان میں دونوں شکلوں میں برابر ہے۔ بعد کے منتخب کلیات بھی اسی انتخاب پر شائع کی گئی تھیں۔ تاہم اس مطالعہ کے ضمن میں ہم یہ بات کہ سکتے ہیں کہ معنیاتی نظام میں "آسماں تہِ آب" کی غزل جدیدیت کے کسی کُلی حقیقی بیانیے پر یقین نہیں رکھتی بلکہ مابعد جدیدیت کے بین الاقوامی علمی تصورات کے مطالعاتی حوالوں میں ایسے علمیاتی

مباحث پر مبنی ہے جو علم، حقیقت، پیش گوئی، تجربیت اور عقلیت کے کردار کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ درج بالا اشعار انسانی شعور کا ایک ایسا نظام قائم کرنے میں مدد دیتے ہیں جو وقت، جسم، توانائی، زبان اور طاقت کے سائنسی و سماجی اثرات سے تشکیل پاتا ہے، یہاں شعور کو حیاتیاتی بنیادوں پر دیکھا گیا نہ کہ محض جمالیاتی یا آلے کے طور پر۔ یہاں وقت نیوٹن کے تصور سے نہیں بلکہ آئین سٹائن کے تصور سے متاثر ہے۔ یہاں تجربے کا مرکز جسم ہی کو رکھا گیا ہے مگر شعر کو بھی محدود مانا گیا ہے۔ یہاں اس کا تاثر عام ملتا ہے کہ ہر تجربہ زبان اور سائنسی میتھڈ پر پورا نہیں اتر سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

1۔ محمد آصف اعوان، ڈاکٹر، پروفیسر "مغربی تہذیب کے مشرقی نقاد" بزمِ اقبال، لاہور، 2012ء، ص53

2. August Comte: “Positive Philosophy”(Translated by Harriet Martineau), Batoche Books, Kitchener,2000, P:29

3.https://en.wikipedia.org/wiki/Michelson%E2%80%93Morley_experiment,12:12p.m. Dated:16.12.2025

4. آئین سٹائن کے اس خط کا اصل تصویری متن اس لنک پر موجود ہے :
https://docsteach.org/document/letter-from-albert-einstein-to-president-franklin-d-roosevelt,12:12p.m. Dated:16.12.2025

5. Kuhn, Thomas S. “The Structure of Scientific Revolutions”. 4th ed., with an introductory essay by Ian Hacking. Chicago and London: The University of Chicago Press, 2012, P10

6. Feyerabend, Against Method, 3rd ed., London & New York: Verso, 1993, P14

7. Popper, “The Logic of Scientific Discovery”, London and New York- Routledge classic, 2002, P53

8. Lyotard, The Postmodern Condition: A Report on Knowledge, Introduction, V 10, Manchester University Press, 1984

9. Foucault, The Archaeology of Knowledge Translated by A M Sheridan Smith,Pantheon Books, New York, 1972, P 200

10. Foucault, Power/Knowledge, Pantheon Books, New York, 1980, P 59

11. Foucault, Power/ Knowledge, 1980, P131

12. Foucault, The Order of Things, Vintage Books, New York, 1971, P345

13۔ بشیر بدر: "آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ" ایجوکیشنل پبلیکیشنز، دہلی، 1981، ص19

14۔ شعیب الرحمٰن: "توصیف تبسم کی نظم نگاری" (ایم فل اردو)، شعبہ اردو، رفاہ انٹر نیشنل یونیورسٹی، فیصل آباد کیمپس، 2022-2024، ص20

15۔ شعیب الرحمٰن: "خوئی اور ستارہ- متنی و معنوی جہات" (ایم اے اردو)، شعبہ اُردو، پنجاب یونیورسٹی لاہور، 2017-2019، ص9

16۔ آفتاب اقبال شمیم: (فلیپ) آسماں تہِ آب از توصیف تبسم، فضلی بُک سپر مارکیٹ، کراچی، 2019ء

17۔ توصیف تبسم: "آسماں تہِ آب"، ص139

18۔ ایضاً، ص139

19۔ ایضاً، ص141

20۔ ایضاً، ص167

21۔ ایضاً، ص215

22۔ ایضاً، ص202

23۔ ایضاً، ص141
24۔ ایضاً، ص146
25۔ ایضاً، ص150
26۔ ایضاً، ص146
27۔ ایضاً، ص150
28۔ ایضاً، ص152
29۔ ایضاً، ص160
30۔ ایضاً، ص198

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

Roman Havalajat

1. M Asif Awan, Prof, Dr: Maghrabi Tehzeeb Ky Maghrabi Naqaad, Bazm E Iqbal, Lahore,2012, P53
2. August Comte: "Positive Philosophy"(Translated by Harriet Martineau), Batoche Books, Kitchener,2000, P:29
3.https://en.wikipedia.org/wiki/Michelson%E2%80%93Morley_experiment,12:12p.m.Dated:16.12.2025
4.https://docsteach.org/document/letter-from-albert-einstein-to-president-franklin-d-roosevelt,12:12p.m. Dated:16.12.2025
5. Kuhn, Thomas S. The Structure of Scientific Revolutions. 4th ed., with an introductory essay by Ian Hacking. Chicago and London: The University of Chicago Press, 2012, P:10
6. Feyerabend, Against Method, 3rd ed., London & New York: Verso, 1993, P:14
7. Popper, "The Logic of Scientific Discovery", London and New York- Routledge classic, 2002, P53
8. Lyotard, The Postmodern Condition: A Report on Knowledge, Introduction, V 10, Manchester University Press, 1984
9. Foucault, The Archaeology of Knowledge Translated by A M Sheridan Smith,Pantheon Books, New York, 1972, P: 200
10. Foucault, Power/Knowledge, Pantheon Books, New York, 1980, P: 59
11. Foucault, Power/ Knowledge, 1980, P131
12. Foucault, The Order of Things, Vintage Books, New York, 1971, P:345
13. Bashir Badar;" Azadi K Bad Ki Ghazal ka Tanqeedi Mutala, Anjaman Traqi Urdu, Dehli,1981, P:19
14. Shoaib Ur Raman: TouseefTabasum Ki NazmNigari,(MPhil Urdu), Riphah International University, Faisalabad Campus, 2022-2024, P:20
15. Shoaib Ur Rahman: Koi Aur Sitara-Matni O Manvi Jihat,(M A Urdu), PU Lahore, 2017-2019,P:9
16.Aftab Iqbal Shameem(Flap):AsmaN Tah EAb, Fazli Books, Karachi, 2019
17. Touseef Tabasum: AsMan Tah E Ab, P:139
18. Ibid, P:139
19. Ibid, P:141
20. Ibid, P:167
21. Ibid, P:215
22. Ibid, P:202
23. Ibid, P:141
24. Ibid, P:146
25. Ibid, P:150

26. Ibid, P:146
27. Ibid, P:150
28. Ibid, P:152
29. Ibid, P:160
30. Ibid, P:198